

سُورَۃُ الفَاتِحَہ

کی اہمیت و عظمت
اور
نماز میں اسکی فرضیت

ترتیب و تالیف

حافظ عبدالجبار بن عبدالرحمٰن

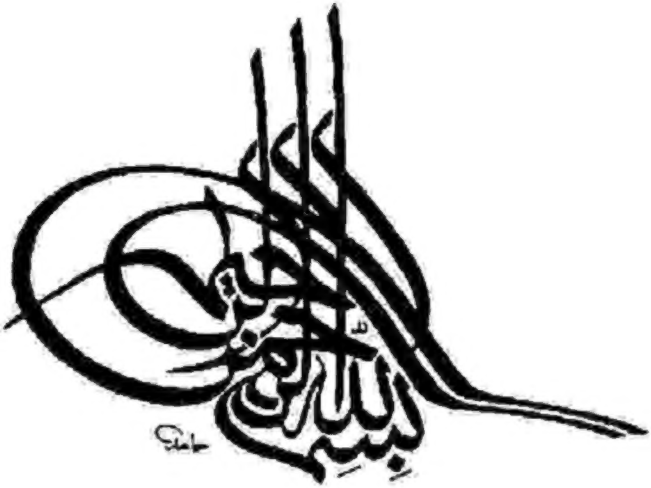
(فاضل مدینہ یونیورسٹی)

باہتمام و زیر سرپرستی

چوہدری عنایت اللہ گھلنوی

ناظم جامع مسجد قباء

74-چناب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور



اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

سورۃ الفاتحہ

کی اہمیت و عظمت

اور

نماز میں اسکی فرضیت

ترتیب و تالیف

حافظ عبدالجبار بن عبدالرحمٰن

(فاضل مدینہ یونیورسٹی)

باھتمام و زیر سرپرستی

چوہدری عنایت اللہ گھلنوی

ناظم۔ جامع مسجد قباء

74۔ چناب بلاک۔ علامہ اقبال ٹاؤن۔ لاہور

فہرست

سورۃ الفاتحہ کے بہت سے نام ہیں سب سے زیادہ مشہور نام "فَاتِحَةُ الْكِتَابِ ، أُمُّ الْكِتَابِ اور اَلْفَاتِحَه" ہے۔

اَلْفَاتِحَه:-

اَلْفَاتِحَه کا معنی ابتداء کرنا،شروع کرنا ہے کیونکہ یہ سورت قرآن کے شروع میں ہے اس لیے اس کا نام فاتحہ رکھا گیا ہے۔چنانچہ امام راغب اصفہانی اپنی کتاب مفردات میں فرماتے ہیں:

" فَاتِحَةُ كُلِّ شَيْءٍ مَبْدَاُهُ الَّذِي يُفْتَحُ بِهِ مَا بَعْدَهُ وَبِهِ سُمِّيَ فَاتِحَةُ الْكِتَابِ" (مفردات ۲/۷۷۶)

ترجمہ: ہر چیز کی فاتحہ اس کے شروع کے مقام کو کہتے ہیں جس سے اس کے مابعد کا افتتاح کیا جائے اس لیے اس سورت الفاتحہ کا نام فاتحہ رکھا گیا ہے۔کیوں کہ اس کے بعد کا اس سے افتتاح کیا جاتا ہے۔

اس سورت کا یہ نام احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے اور صحابہ کرامؓ نے بکثرت لیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کی اہمیت کتنی ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی موجودہ جگہ قرآن کریم کے شروع میں رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق ہے۔

أُمُّ الْكِتَابِ/أُمُّ الْقُرْآنِ:-

اس سورت کا نام "أُمُّ الْكِتَابِ اور أُمُّ الْقُرْآنِ" بھی ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے:

"سُمِّيَتْ أُمَّ الْكِتَابِ لِأَنَّهُ يُبْدَأُ بِكِتَابَتِهَا فِي الْمَصَاحِفِ وَ يُبْدَأُ بِقِرَاءَتِهَا فِي الصَّلَاةِ" (صحیح بخاری کتاب التفسیر)

ترجمہ: سورت فاتحہ کا نام أُمُّ الْكِتَابِ اس لیے رکھا گیا ہے کیونکہ قرآن کی کتابت کی ابتداء اس سے ہوتی ہے اور نماز میں قرآت کی ابتداء بھی اس سے ہوتی ہے۔

امام ابن جریرؒ نے بھی امام بخاری کی موافقت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ أُمُّ الْقُرْآنِ اس لیے ہے کیونکہ یہ قرآن کی باقی سورتوں سے پہلے ہے اور دیگر تمام قرآن کی قرآت اور کتابت اس کے بعد ہے۔اسی طرح علامہ بدرالدین عینی نے بھی امام بخاری کی موافقت کی ہے۔(عمدۃ القاری 458/8)

اَلسَّبْعُ الْمَثَانِي:-

کیونکہ اس سورت کی سات آیات ہیں اور اسے ہر نماز میں اور ہر رکعت میں پڑھا جاتا ہے اس لیے اس سورت کا ایک نام "اَلسَّبْعُ الْمَثَانِي" بھی ہے۔ اَلسَّبْعُ کا معنی ہے سات اور اَلْمَثَانِي کا معنی ہے بار بار پڑھی جانے والی۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے کہ:

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ۝ (سورۃ الحجر: ۸۷)

ترجمہ: اور ہم نے آپ ﷺ کو سات (آیتیں) جو (نماز میں) بار بار پڑھی جاتی ہیں اور عظمت والا قرآن عطا فرمایا ہے۔

اَلْقُرْاٰنُ الْعَظِيْمُ:-

اس سورت کا نام "اَلْقُرْاٰنُ الْعَظِيْمُ" بھی ہے۔ اس کا یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے کیونکہ قرآن کے تمام علوم اس میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ امام قرطبیؒ فرماتے ہیں

"سُمِّيَتْ بِذٰلِكَ لِتَضَمُّنِهَا جَمِيْعَ عُلُوْمِ الْقُرْاٰنِ" (تفسیر القرطبی ۱/۱۵۱)

ترجمہ: اسکا نام اَلْقُرْاٰنُ الْعَظِيْم اس لیے ہے کیونکہ یہ قرآن کے تمام علوم پر مشتمل ہے۔ پھر وہ اس کے ساتھ ہی قرآن کے جملہ مضامین کا تذکرہ کرتے ہیں جس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔ (اِنْشَاءَ اللّٰہُ)

اَلشَّفَاءُ:-

اس سورت کا ایک نام "اَلشَّفَاءُ" بھی ہے۔ امام دارمیؒ نے ابو سعید الخدریؓ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "فَاتِحَةُ الْكِتَابِ شِفَاءٌ مِنْ كُلِّ سَمٍّ" یعنی سورۃ فاتحہ میں ہر زہر سے شفاء ہے۔

اَلرُّقْيَةُ:-

اس سورت کا ایک نام "اَلرُّقْيَةُ" بھی ہے۔ جیسا کہ ابو سعیدؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی سے کہا جس نے ڈنگے ہوئے انسان پر سورۃ الفاتحہ پڑھ کر دم کیا تھا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ رقیہ ہے۔ یعنی یہ رقیہ (دم) ہے جائز ہے۔

اَلصَّلاۃُ:-

اس سورت کا ایک اہم نام "اَلصَّلاۃُ" بھی ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"قَسَمْتُ الصَّلٰوۃَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَ عَبْدِیْ نِصْفَیْنِ" (الدارمی ۲/۴٤٥)

ترجمہ: میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھی آدھی تقسیم کردی ہے۔

اس سے مراد سورۃ فاتحہ ہے جس کا نصف حصہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور اس کی رحمت و ربوبیت کے بیان میں ہے اور باقی نصف حصے میں دعا و مناجات ہیں۔ اس حدیث میں فاتحہ کو نماز سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ نماز کا ضروری رکن ہے اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

سید عبدالقادر جیلانیؒ غنیۃ الطالبین (ص: ۸٥۳) میں فرماتے ہیں:

"فَإِنَّ قِرَاءَتَهَا فَرِيْضَةٌ وَ هِيَ رُكْنٌ تَبْطُلُ الصَّلَاةُ بِتَرْكِهَا"

ترجمہ: اس (فاتحہ) کی قرأت نماز میں فرض ہے اور یہ ضروری رکن ہے اگر کوئی نہ پڑھے تو اس کی نماز باطل ہوجائے گی۔

پورے قرآن میں سے صرف سورت فاتحہ کو ہی نماز کا رکن قرار دیا گیا ہے اور باقی کی قرأت میں اختیار دیا گیا ہے کہ جہاں سے چاہو قرآن پڑھو۔ اسکی وجہ علامہ ابراہیم میر سیالکوٹیؒ یہ بتاتے ہیں کہ یہ پڑھنے میں آسان، مضمون میں جامع اور سارے قرآن کا خلاصہ ہے اتنے اوصاف والی کوئی اور سورت نہیں ہے۔ (اِنْتَهٰى مُلَخَّصًا)

اَلْأَسَاسُ:-

اس کے ناموں میں سے ایک نام "اَلْأَسَاسُ" بھی ہے۔ ایک آدمی نے امام شعبیؒ سے پسلی میں تکلیف کی شکایت کی تو انہوں نے کہا کہ قرآن کی اساس، فَاتِحَۃُ الْکِتَابِ کو لازم پکڑو کیونکہ میں نے ابن عباسؓ سے سنا وہ فرماتے تھے کہ ہر چیز کی بنیاد ہے اور دنیا کی بنیاد مکہ ہے کیونکہ وہاں سے ہی زمین کا بچھاؤ شروع ہوا، اور قرآن کی اَسَاسُ فاتحہ ہے اور فَاتِحَۃُ کی اَسَاسُ بِسْمِ اللّٰہِ ہے۔ تو جب تمہیں تکلیف ہو تو سورۃ الفاتحہ پڑھ لیا کرو شفاء ہوگی۔ (تفسیر قرطبی)

سُوْرَةُ الْفَاتِحَه کے نزول کی جگہ:-

اس میں اہل علم کا اختلاف ہے کہ کیا سُوْرَةُ الْفَاتِحَه مکی ہے یا مدنی۔ تو عبداللہ بن عباسؓ، قتادہؓ، ابوالعالیہؒ (رُفیع) وغیرہ اھل علم کا قول ہے کہ یہ مکی ہے جبکہ ابوہریرہؓ، عطاء بن یسارؒ اور امام زھریؒ کا خیال ہے کہ یہ مدنی ہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ اس کا آدھا حصہ مکہ میں نازل ہوا اور آدھا مدینہ میں نازل ہوا لیکن ان میں پہلا قول زیادہ صحیح ہے کہ یہ مکے میں نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ سورۃ الحجر میں آیا ہے:

"وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ O (سورۃ الحجر:٨٧)

ترجمہ: اور ہم نے آپ ﷺ کو سات (آیتیں) جو (نماز میں) بار بار پڑھی جاتی ہیں اور عظمت والا قرآن عطا فرمایا ہے اور سورۃ الحجر بالاتفاق مکی ہے۔ تو جب سورۃ الحجر مکی ہے تو سورۃ الفاتحہ بطریق اولیٰ مکی ہوئی نیز نماز کی فرضیت مکے میں ہی ہوئی تھی اور نماز کا بغیر فاتحہ کے پڑھنا اس کا تصور ہی نہیں ہوسکتا کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

"لَا صَلٰوةَ اِلَّا بِفَاتِحَةِ الْکِتَابِ"

(بخاری:٧٥٦/مسلم:٣٩٤/ ابوداود:٨٢٢/النسائی:١٣٧) ترجمہ: فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

فَضَائِلُ سُوْرَةِ الْفَاتِحَه:-

صحیح بخاری میں ہے کہ ابوسعید بن المعلیٰؓ کہتے ہیں کہ میں نماز پڑھ رہا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے آواز دی تو میں نے نماز کی وجہ سے آپکو جواب نہ دیا۔ تو جب میں نماز کے بعد آپ ﷺ کے پاس آیا تو آپ نے پوچھا کہ تم کیوں نہیں آئے۔ تو میں نے کہا کہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا:

"یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ" (سورۃ الانفال آیت نمبر:٢٤)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ اور رسول جب تمہیں بلائیں تو ان کی بات قبول کرو۔

پھر آپ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں قرآن کی سب سے بڑی سورت نہ بتاؤں پہلے اس کے کہ آپ مسجد سے نکلیں تو کہنے لگے کیوں نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا۔ تو جب آپ نکلنے لگے تو میں نے آپ کو یاد دلایا کہ آپ نے یہ فرمایا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنُ الْعَظِيْمُ الَّذِيْ اُوْتِيْتُهٗ" تو یہ سورۃ الفاتحہ ہے جو مجھے دی گئی ہے۔

امام ترمذیؒ نے بسند حسن روایت کیا ہے کہ ابلیس لعین نے چار بار چیخ ماری (۱) جب اسکو لعنت کی گئی، (۲) جب اسکو جنت سے نکالا گیا، (۳) جب محمد ﷺ کو نبی بنایا گیا اور (۴) جب سورۃ الفاتحہ کو نازل کیا گیا۔

اسی طرح مسند دارمی میں ہے کہ "مَا اُنْزِلَتْ فِي التَّوْرَاةِ وَلَا فِي الْاِنْجِيْلِ وَ الزَّبُوْرِ وَ الْقُرْآنِ مِثْلُهَا" یعنی قرآن، تورات، انجیل اور زبور میں سورۃ الفاتحہ جیسی عمدہ سورت اور نہیں اتاری گئی۔

سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں ہے کہ اُبی بن کعبؓ نے کہا کہ ایک دیہاتی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ میرے بیٹے کو تکلیف ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تکلیف ہے تو اس نے کہا کہ اسے آسیب ہے تو آپ نے فرمایا اس کو میرے پاس لے آؤ۔ وہ لے آیا تو آپ نے اس کو اپنے سامنے بٹھایا اور اس پر سورت فاتحہ اور دیگر آیات سے دم کیا تو وہ لڑکا اٹھ کر کھڑا ہو گیا گویا اسکو کوئی تکلیف نہیں تھی۔ تو اس واقعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سورت فاتحہ کے اندر بڑی قوت ہے۔

اسی طرح صحیح مسلم میں ابنِ عباسؓ سے مروی ہے کہ جبرائیلؑ رسول ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اوپر سے ایک آواز سنی تو انہوں نے کہا کہ آج آسمان سے ایک دروازہ کھلا ہے جو آج سے پہلے کبھی نہیں کھلا تھا اور پھر اس دروازے سے ایک فرشتہ اُترا۔ تو جبرائیلؑ نے کہا کہ یہ فرشتہ بھی زمین پر پہلی بار اُترا ہے۔ پھر اس فرشتے نے سلام کیا اور کہا آپکو دو نوروں کی خوشخبری ہے۔ یہ دو نور آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے۔ ایک فَاتِحَةُ الْكِتَابِ اور دوسری سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ کی آخری آیتیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سورۃ الفاتحہ جبرائیل علیہ السلام نہیں لائے بلکہ کوئی اور فرشتہ لایا تھا لیکن بعض روایات میں ہے کہ اس سورت کو جبرائیلؑ ہی لائے تھے تو اس میں تطبیق یہ ہے کہ پہلے سورۃ الفاتحہ جبرائیل علیہ اسلام ہی لائے تھے لیکن پھر اس کا اجر وثواب دوسرا فرشتہ لیکر آیا تھا۔

صحیح مسلم ہی میں سیدنا ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو نماز پڑھتا ہے اور اس میں سورۃ الفاتحہ نہ پڑھے تو وہ نماز ناقص ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے تین دفعہ فرمایا کہ اس کی نماز ناقص ہے پوری نہیں۔ تو ابو ہریرۃؓ سے کہا گیا کہ ہم امام کے پیچھے ہوتے ہیں (تو کیا امام کے پیچھے بھی سورۃ الفاتحہ پڑھیں) تو آپؓ نے فرمایا کہ اسکو اپنے نفس میں پڑھو کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کیا ہے اور میرا بندہ جو مجھ سے سوال کرے۔ تو جب بندہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ'' کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''حَمِدَنِيْ عَبْدِيْ'' میرے بندے نے میری تعریف کی۔ اور جب بندہ ''اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''اَثْنٰى عَلَيَّ عَبْدِيْ'' میرے بندے نے میری ثناء بیان کی۔ تو جب بندہ ''مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''مَجَّدَنِيْ عَبْدِيْ'' میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی اور کبھی فرماتے ہیں کہ میرے بندے نے اپنا معاملہ میرے سپرد کر دیا۔ تو جب بندہ کہتا ہے ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرا بندہ جو سوال کرے (وہ اس کو ملے گا) اور جب بندہ کہتا ہے ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ ○ (آمین)'' تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرا بندہ جو سوال کرے گا۔

(صحیح مسلم۔ کتاب الصلاۃ بَابُ قِرَاْءَةِ الْفَاتِحَةِ فِيْ كُلِّ رَكْعَةٍ)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ الفاتحہ کی بڑی شان ہے کہ یہ اللہ اور اس کے بندے کے درمیان ایک مناجات کا سلسلہ ہے۔ جو اللہ رب العالمین کی اپنے بندے سے محبت کی

نشانی ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ سے مانگنے کا طریقہ ہے۔ یعنی کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی تعریف وعظمت بیان کی جائے۔ پھر اللہ تعالیٰ سے جو مانگنا ہے مانگا جائے۔

اور ابن العربیؒ کہتے ہیں کہ "مَا اَنزَلَ اللّٰهُ فِي التَّوْرَاةِ وَلَا فِي الْإِنجِيلِ وَلَا فِي الْقُرْآنِ مِثْلَهَا" اسکا مطلب ہے کہ اللہ نے تورات وانجیل اور قرآن میں اس (فاتحہ) جیسی کوئی سورت نہیں اُتاری۔

اسی طرح جامع الترمذی میں ابیؓ بن کعب بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سورت فاتحہ جیسی سورت نہ تورات میں نہ انجیل میں نازل کی۔ اور یہ سبع مثانی ہے اور یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان تقسیم کی گئی ہے۔ (اسکی سند حسن ہے)

اس حدیث سے بھی سورت فاتحہ کی اہمیت واضح ہو رہی ہے۔ امام قرطبیؒ نے اس حدیث کی تشریح میں حافظ ابن حبان البستی کا قول نقل کیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تورات اور انجیل پڑھنے والے کو اتنا ثواب نہیں دیتا جتنا ثواب اللہ تعالیٰ سورت فاتحہ پڑھنے والے کو دیتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اس امت محمدیہ عَلٰى صَاحِبِهَا الصَّلٰوةُ وَالتَّسْلِيْمُ کو دیگر امتوں پر فضیلت دی ہے اور اسکو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کے پڑھنے پر زیادہ ثواب کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ فاتحہ ان سب کتابوں سے زیادہ افضل ہے۔ اور جب کوئی چیز افضل سے بھی بہتر ہو تو وہ سب سے بہتر ہوگی جسطرح کہتے ہیں کہ زید علماء سے افضل ہے اسکا معنی ہے کہ وہ تمام لوگوں سے بھی افضل ہے۔ (تفسیر قرطبی ج ۱ ص ۱۴۷/۱۴۸)

اسی طرح سیدنا علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "فَاتِحَةُ الْكِتَابِ اور آيَةُ الْكُرْسِي اور شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اور قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ یہ آیات اللہ تعالیٰ کے عرش کے ساتھ معلق ہیں ان کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہے۔ (تفسیر قرطبی)

جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ سورۃ الفاتحہ کا ایک نام رُقیہ بھی ہے۔ رُقیہ یعنی دم کرنا۔ اس سورت کو رُقیہ اس لیے کہتے ہیں کیونکہ امام بخاریؒ صحیح بخاری میں ابو سعید خدریؓ سے ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ہم ایک دفعہ ایک سفر میں تھے کہ رات کے وقت ہم نے ایک جگہ پڑاؤ

کیا وہاں ہمارے پاس ایک لونڈی آئی اور کہنے لگی کہ اس وادی کے سردار کو ایک بچھو نے کاٹ لیا ہے اور ہمارے قبیلے کے لوگ کسی جگہ گئے ہوئے ہیں۔ کیا تم میں سے کوئی دم کر سکتا ہے ابو سعیدؓ گئے اور سورۃ الفاتحہ سے دم کیا تو وہ سردار ٹھیک ہو گیا۔ سردار نے بطور انعام خوشی میں ان کو تمیں بکریاں دیں اور دودھ بھی پلایا۔ جب آپؓ لوٹ کر ہمارے پاس آئے تو ہم نے پوچھا کہ آپ کوئی منتر جانتے ہیں تو ابو سعیدؓ نے کہا کہ میں منتر وغیرہ کچھ نہیں جانتا البتہ میں نے سورۃ الفاتحہ پڑھ کر دم کیا تو وہ ٹھیک ہو گیا۔ پھر ہم نے ان بکریوں کے بارے میں خاموشی اختیار کر لی کہ جب تک رسول اللہ ﷺ سے نہ پوچھ لیں تب تک ان کو نہ کھائیں گے۔ پھر جب ہم مدینہ واپس آئے تو رسول اللہ ﷺ کو اس سارے واقعہ کے بارے میں بتایا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم سے کس نے کہا کہ سورۃ الفاتحہ کا دم ناجائز ہے بلکہ یہ جائز ہے۔ ان بکریوں کو تقسیم کر لو اور میرا حصہ بھی رکھو۔ (بخاری: باب فضل فاتحة الكتاب)

سُوْرَۃُ الْفَاتِحَةِ کو باقی قرآن سے پہلے کیوں لایا گیا؟:-

جمہور اہل علم کی رائے یہ ہے کہ قرآن کی ترتیب توقیفی ہے یعنی قرآن کی موجودہ ترتیب جو ہمارے پاس ہے یہ اسی طرح نازل ہوا تھا اسی طرح جبرائیل علیہ السلام نبی ﷺ پر لیکر اُترے تھے۔ اور یہی ترتیب سیدنا عثمانؓ نے قرآن کو جمع کرتے وقت رکھی تھی۔ اور کسی صحابی نے اسمیں اختلاف نہیں کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترتیب اجماعی و اتفاقی ہے۔ شیخ مناع القطان نے اپنی کتاب مُبَاحِثُ فِيْ عُلُوْمِ الْقُراٰنِ میں ابن الحصار کا قول نقل کیا ہے کہ سورتوں اور آیتوں کی ترتیب یہ سب وحی الٰہی کے مطابق ہے۔ جب کوئی آیت اُترتی تو رسول اللہ ﷺ فرماتے اس آیت کو فلاں جگہ لکھو۔ اس طرح قرآن تواتر سے نقل ہوتا رہا اور اسی ترتیب سے نبی ﷺ تلاوت کرتے رہے جس سے یقین حاصل ہو گیا کہ یہی ترتیب صحیح ہے۔ اسی طرح علامہ کرمانیؒ نے برہان میں ذکر کیا ہے کہ "تَرْتِيْبُ السُّوَرِ هٰذَا هُوَ عِنْدَ اللهِ فِي اللَّوْحِ الْمَحْفُوْظِ عَلٰى هٰذَا التَّرْتِيْبِ وَعَلَيْهِ كَانَ ﷺ يَعْرِضُ عَلٰى جِبْرَائِيلَ كُلَّ سَنَةٍ" یعنی کہ سورتوں کی موجودہ ترتیب لوح محفوظ میں بھی اللہ کے ہاں اسی طرح ہے اور اس ترتیب کے مطابق رسول

ﷺ جبرائیل علیہ السلام پر قرآن پیش کرتے تھے۔ جب آپ ﷺ اس کے ساتھ قرآن کا دور کرتے اور آخری سال جس سال آپ ﷺ نے وفات پائی دو دفعہ جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ دور کیا۔ اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ ترتیب اللہ تعالیٰ کے پاس لوح محفوظ میں تھی اور رسول اللہ ﷺ جو جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ دور کرتے وہ بھی یہی ترتیب ہے اور یہ جو بعض صحیح روایات میں ہے کہ سب سے پہلے قرآن "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ" کی چند آیات اتری ہیں اور پھر سُوْرَۃُ الْمُدَّثِّر کی آیات ہیں۔ تو اس کا معنی یہ ہے کہ یہ آیات ابتدائی نزول کی ہیں لیکن یہ اس ترتیب کے مخالف نہیں ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے دور میں تھی۔ کیونکہ ہمارے پاس جو موجودہ قرآن ہے یہ وہی ترتیب ہے جو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دور مبارک میں دلوائی گئی تھی اور اس پر اجماع ہو چکا تھا اور اس کا کوئی مخالف بھی نہیں تھا۔ کیونکہ اگر اس کا کوئی مخالف ہوتا تو ہمیں اس کی کوئی نقل ملتی۔ اگرچہ کچھ شاذ طور پر معمولی سا اختلاف ہے لیکن جمہور صحابہؓ کا اس پر اتفاق تھا، کیونکہ اُمت محمدیہ عَلٰی صَاحِبِھَا الصَّلٰوۃُ وَالتَّسْلِیْمُ کسی غلط مسئلے پر جمع نہیں ہوسکتی اور پھر یہ قرآن جو اللہ کی آخری کتاب ہے اور قیامت تک یہ باقی رہنے والی آسمانی کتاب ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا ہوا ہے۔ کسی زیر و زبر کی اس میں غلطی نہیں ہوسکتی، خواہ اس کے اندر کوئی کتنی بھی ناکام کوشش کر کے دیکھ لے۔ آخر نتیجہ وہ خائب و خاسر ہو کر لوٹے گا۔ بڑی بڑی قوموں نے اس میں تبدیلی کی بڑی بڑی کوشش کی لیکن وہ اپنے منہ کے بل ایسے گرے کہ قیامت تک کے لیے عبرت کا نشان بن گئے اور دوبارہ اٹھ نہ سکے۔

تو ہر ایک کو پتہ ہے کہ سب سے پہلے اقراء یا مدثر کی آیات ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کا جو محل وقوع ہے یہ اس کی غمازی کرتا ہے کہ یہی ترتیب عِنْدَ اللّٰہِ وَعِنْدَ الرَّسُوْلِ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ کی پسندیدہ ہے۔

اگرچہ بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ سب سے پہلے سورۃ الفاتحہ نازل ہوئی ہے تو اس قول کے متعلق علامہ دکتور مناع القطان نے اپنی مشہور کتاب میں یہ لکھا ہے کہ "لَعَلَّ الْمُرَادُ اَوَّلُ سُوْرَۃٍ کَامِلَۃٍ" کہ شاید اس سے مراد مکمل سورت ہے۔ (المباحث فی علوم القرآن)

دوسری وجہ سورت الفاتحہ کو پہلے لانے کی یہ ہے کہ قرآن کے اندر جتنے علوم ہیں وہ سب اجمالی طور پر اس سورت میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ علامہ ابراہیم میر سیالکوٹیؒ نے تفسیر کبیر پر حاشیہ ابوالسعود کے حوالہ سے لکھا ہے کہ قرآن میں مندرجہ ذیل امور کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

"اَلثَّنَاءُ عَلَى اللّٰهِ عِزَّوَجَلَّ وَ التَّعَبُّدُ بِاَمْرِهٖ وَ نَهْيِهٖ وَ بَيَانُ وَعْدِهٖ وَوَعِيْدِهٖ اَوْ عَلٰى جُمْلَةِ مَعَانِيْهِ مِنَ الْحِكَمِ النَّظْرِيَةِ وَالْاَحْكَامِ الْعَمَلِيَّةِ اَلَّتِيْ هِيَ سُلُوْكُ الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِيْمِ وَ الْاِطْلَاعُ عَلٰى مَعَارِجِ السُّعَدَاءِ وَ مَنَازِلِ الْاَشْقِيَاءِ" ۔(حاشیہ ابی السعود بر تفسیر کبیر صفحہ 50-51)

ترجمہ: قرآن میں اللہ تعالیٰ کی ثناء اور امر و نہی میں اسی کا بندہ بن کر رہنا اور اللہ کے وعدے اور وعید (عذاب) کا ذکر یا اس وجہ سے کہ سورۃ فاتحہ قرآن کریم کے جملہ اہم مقاصد پر مشتمل ہے یعنی حکمت نظری اور احکام عملیہ جن پر کاربند ہونا صراط مستقیم پر چلنا ہے اور نیز سعادت مندوں کے بلند درجوں اور بدبختوں کی نچلی منزلوں کی اطلاع پر بھی مشتمل ہے۔ (ترجمہ منقول از واضح البیان فی تفسیر اُم القرآن علامہ ابراہیم میر، ص 44)۔

اس لیے اس سورت کو اُمُّ الْقُرْاٰنِ بھی کہتے ہیں کہ قرآن کے تمام اہم مقاصد (جن کا تذکرہ اوپر گزرا ہے) کو یہ سورت محیط ہے۔ اس لیے اس سورت کو پہلے لایا گیا ہے۔

سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ اور نماز:

یہ بات یاد رہے کہ سورۃ الفاتحہ نماز کا اہم ترین رکن ہے۔ اگر کوئی نہ پڑھے تو اس کی نماز نہ ہوگی اگرچہ بعض احادیث میں عدم فہم کی وجہ سے اس میں اختلاف کیا گیا ہے کہ کیا سورۃ الفاتحہ نماز میں واجب ہے یا نہیں۔ تو امام مالک اور اس کے شاگرد کہتے ہیں کہ یہ امام اور منفرد کے لیے ہر رکعت میں فرض ہے۔ یہاں تک کہ ابن خویز منداد البصری نے کہا ہے کہ امام مالک کا قول اس میں متفق ہے کہ اگر کوئی بھول جائے اور سورت الفاتحہ نہ پڑھ سکے تو اس کی نماز نہ ہوگی۔ دیکھیے (تفسیر القرطبی ج 1/ص 157)۔

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ اور اس کے موافقین کہتے ہیں کہ اگر نماز میں

سورۃ الفاتحہ کے علاوہ اور کچھ بھی قرآن سے پڑھ لے تو نماز صحیح ہوگی۔ ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کے فرمان کا عموم ہے:

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ط

ترجمہ: جو قرآن سے آسان ہو اس کو پڑھو۔

تو اہل علم اس بارے میں فرماتے ہیں کہ سورۃ الفاتحہ کے علاوہ مَا تَيَسَّرَ کہ جو آسان ہو پڑھو۔

اور اسی طرح ابو ہریرہؓ کی حدیث جو کہ بخاری و مسلم میں ہے کہ جو مُسِيْئُ الصلوٰۃ (نماز میں غلطی کرنے والا) کے نام سے مشہور حدیث ہے۔ اس میں ہے: "اِذَا قُمْتَ اِلَى الصَّلَاةِ فَكَبِّرْ ثُمَّ اقْرَأْ مَا تَيَسَّرَ مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ" کہتے ہیں کہ آپ کا حکم مَا تَيَسَّرَ ہے یعنی جو آسان ہو وہ قرآن پڑھے۔ سورۃ الفاتحہ کا تعین نہیں کیا۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ اگر سورۃ الفاتحہ نہ پڑھے تو اس کی نماز درست ہوگی۔ لیکن اس کا جواب صاحب التحفہ نے یہ دیا ہے کہ ابوداؤد میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس کو سورۃ الفاتحہ پڑھنے کا حکم دیا تھا اور اس مَا تَيَسَّرَ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ سورۃ الفاتحہ کے بعد جو آسان ہو وہ پڑھو۔ (تحفۃ الاحوذی شرح الجامع الترمذی)

دوسرا قول یہ ہے کہ نماز میں فاتحہ کی قرأت متعین ہے اور اس کے بغیر نماز نہ ہوگی۔ یہ قول باقی اہل علم، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور جمہور اہل علم کا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"مَنْ صَلّٰى صَلَاةً لَمْ يَقْرَأْ فِيْهَا بِاُمِّ الْقُرْآنِ فَهِيَ خِدَاجٌ (ثَلَاثًا غَيْرُ تَمَامٍ)"

ترجمہ: جو نماز پڑھے اور سورۃ فاتحہ نہ پڑھے تو اس کی نماز ناقص ہے ناقص ہے۔ پوری نہیں ہے (تین دفعہ فرمایا)۔ صحیح مسلم عَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃ رضی اللہ عنہ

اسی طرح عبادۃ بن الصامتؓ کی حدیث جو کہ بخاری و مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ"

بخاری کتاب الاذان۔ باب وجوب القراءۃ للامام والمأموم فی

الصلوات کلھا۔(مسلم۔بَابُ وُجُوبِ قِرَاءَ ةِ الْفَاتِحَة فِيْ كُلِّ رَكْعَةٍ)

ترجمہ: اس آدمی کی نماز نہ ہوگی جو سورۃ الفاتحہ نہ پڑھے۔ یہاں لفظ مَنْ عام ہے یعنی کسی کی نماز نہ ہوگی جب تک فاتحہ نہ پڑھے گا۔

اور صحیح ابن خزیمہ اور ابن حبان میں ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"لَا تُجْزِئُ صَلَاةٌ لَا يُقْرَأُ فِيْهَا بِاُمِّ الْقُرْآنِ"

ترجمہ: اس آدمی کی نماز کفایت نہ کرے گی جو نماز میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے۔(تفسیر ابن کثیر 1/3)

تو اس سے یہ واضح ہوا کہ سورۃ الفاتحہ کے بغیر نماز نہ ہوگی۔ خواہ امام ہو یا منفرد ہو یا امام کے پیچھے ہو۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے نماز کے بعد پوچھا کہ کیا تم میں سے کسی نے میرے پیچھے قرأت کی ہے۔ تو بعض صحابہؓ نے اثبات میں جواب دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پیچھے سورۃ الفاتحہ کے علاوہ کچھ نہ پڑھو۔(ابو داؤد۔الصلاۃ۔الترمذی۔الصلاۃ۔باب فی الْقِرَاءَةُ خَلْفَ الْإِمَامِ)

لیکن اگر امام جہری قرأت کرے تو اس کے پیچھے مقتدی کی قرأت کے بارے میں اہل علم کے تین قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ مقتدی پر بھی قرأت واجب ہے جس طرح امام پر واجب ہے کیونکہ صحیح احادیث کا مفہوم اسی پر دلالت کرتا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی استثنیٰ نہیں کیا۔ امام بخاری اور دیگر محققین کا یہی مسلک ہے اور یہی صحیح مسلک ہے۔ اسی کو امام قرطبی نے ترجیح دی ہے۔ امام بخاری نے یہ باب باندھا ہے۔"بَابُ وُجُوبِ الْقِرَاءَةِ لِلْإِمَامِ وَ الْمَأْمُوْمِ فِي الصَّلَوَاتِ كُلِّهَا فِي الْحَضَرِ وَ السَّفَرِ وَ مَايُجْهَرُ فِيْهَا وَ مَايُخَافَتُ" کہ سورۃ فاتحہ نماز میں ہر ایک پر فرض ہے (امام ہو یا مقتدی، نماز سری ہو یا جہری)۔ دوسرا مسلک یہ ہے کہ مقتدی پر قرأت بالکل واجب نہیں ہے۔ نہ سورۃ الفاتحہ کی اور نہ قرآن کے کسی اور حصے کی۔ خواہ نماز جہری ہو یا نماز سری ہو۔ یہ مسلک اہل کوفہ اور مالکیہ میں، ابن رجب، اشہب، ابن عبد الحکم اور ابن حبیب کا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:"مَنْ كَانَ لَهُ إِمَامٌ فَقِرَاءَةُ الْإِمَامِ لَهُ قِرَاءَةٌ"(رواہ الامام احمد فی مسندہ)۔

ترجمہ: کہ جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قرأت اس کی قرأت ہوگی تو لَـهٗ میں ہٗ ضمیر کا

مرجع امام ہے کیونکہ اگر مقتدی مراد لیں تو پھر لَھُمْ ہونا چاہیے تھا۔ نیز اصول یہ ہے کہ ضمیر قریب کی طرف لوٹتی ہے اور قریب امام ہی ہے۔

لیکن حافظ ابن کثیرؒ اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ (اسنادہ ضعیف) کہ اس کی سند کمزور ہے۔ (ابن کثیر 14/1) ان کی دوسری دلیل جابر بن عبداللہؓ کی روایت ہے۔ یہ روایت موقوف ہے یعنی صحابی جابرؓ کا اپنا قول ہے کہ ''مَنْ صَلّٰی رَکْعَةً لَمْ يَقْرَأْ فِيهَا بِأُمِّ الْقُرْآنِ فَلَمْ يُصَلِّ إِلَّا وَرَاءَ الْإِمَامِ'' ترجمہ: کہ جو شخص کسی رکعت میں سورت الفاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہ ہوگی اِلّا کہ وہ امام کے پیچھے ہو۔ یہ روایت موطا امام مالک میں ہے۔ لیکن اس میں پہلی بات یہ ہے کہ یہ سیدنا جابرؓ کا اپنا قول ہے جو کہ صحیح مرفوع روایات جن میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قرأت کا حکم ہے یہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

نیز امام شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ جابر کی روایت کا مفہوم عبادۃ بن الصامت کی روایتیں جو کہ بخاری و مسلم میں ہیں۔ ان کے منطوق کا مقابلہ نہیں کر سکتا (نیل الاوطار)۔ کیونکہ اصولی طور پر منطوق مفہوم سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ یعنی قرآن وحدیث کی نص مفہوم سے قوی ہوتی ہے۔

امام ابن کثیر اس اثر کے بارے میں فرماتے ہیں'' قَدْ رُوِيَ هٰذَا الْحَدِيثُ مِنْ طُرُقٍ وَلَا يَصِحُّ شَيْءٌ مِنْهَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ (وَاللّٰهُ أَعْلَمُ) یعنی یہ حدیث کئی سندوں سے مروی ہے لیکن کوئی بھی صحیح نہیں ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ مقتدی پر قرأت الفاتحہ سری نمازوں میں واجب ہے۔ جہری نمازوں میں اس پر واجب نہیں ہے۔ ان کی دلیل صحیح مسلم کی روایت ہے جو کہ ابو موسیٰ اشعری سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا وَإِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوا'' ترجمہ: کہ امام اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے تو جب وہ تکبیر کہے تو تم (بھی) تکبیر اور جب پڑھے وہ تو تم خاموش ہو جاؤ۔ اسی طرح یہ حدیث سنن اربعہ وغیرہ میں ابو ہریرہؓ سے مروی ہے اور اس میں بھی ''فَإِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوا'' ہے۔

امام قرطبی آخر میں فرماتے ہیں ''الصَّحِيحُ مِنْ هٰذِهِ الْأَقْوَالِ قَوْلُ الشَّافِعِيِّ وَأَحْمَدَ وَمَالِكٍ فِي الْقَوْلِ الْأَخِيرِ وَإِنَّ الْفَاتِحَةَ مُتَعَيِّنَةٌ فِي كُلِّ رَكْعَةٍ لِكُلِّ أَحَدٍ

عَلَى الْعُمُوْمِ لِقَوْلِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ فِيْهَا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ . وَقَوْلِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ مَنْ صَلّٰى صَلَاةً لَمْ يَقْرَأْ فِيْهَا بِاُمِّ الْقُرْآنِ فَهِيَ خِدَاجٌ ثَلَاثًا وَ قَالَ ابُوهُرَيْرَةَ اَمَرَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ اُنَادِيَ اَنَّهُ لَا صَلَاةَ اِلَّا بِقِرَآءَةِ فَاتِحَةِ الْكِتَابِ فَمَازَادَ .(اخرجه ابو داود ـ تفسير القرطبي 160/1)

ان تمام احادیث کا خلاصہ یہ ہے کہ ان تمام اقوال میں سے امام شافعی اور امام احمد اور امام مالک کا آخری قول ۔ یہ سب سے زیادہ صحیح ہے۔ کہ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ہر ایک پر خواہ امام ہو یا مقتدی یا منفرد، نماز سری ہو یا جہری ہر رکعت میں لازمی ہے وگرنہ اس کی نماز نہ ہوگی ۔ آخر میں انہوں نے صحابہ کرامؓ کے نام بھی لکھے ہیں جن کے نزدیک سورۃ الفاتحہ کا پڑھنا ہر ایک رکعت میں لازم ہے۔(تفصیل کے لیے دیکھیے تفسیر القرطبی 160/1)۔

''وَاِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا'' جو احناف وغیرہ کی دلیل ہے کہ جب امام پڑھے تو مقتدی کو خاموشی سے سننا چاہیے۔ یہ دلیل صحیح نہیں ہے کیونکہ پہلی بات یہ ہے کہ ان لفظوں میں راوی کو وہم لگا ہے اور یہ الفاظ صحیح نہیں ہیں۔ کیونکہ اس روایت میں سلیمان التیمی عن قتادہ میں سلیمان منفرد ہے۔ قتادہ سے دیگر بیان کرنے والے ان لفظوں کو بیان نہیں کرتے۔ امام دارقطنی نے کہا ہے کہ سلیمان کی کسی نے ان لفظوں میں متابعت نہیں کی اور امام ابوداؤد نے بھی اس زیادتی کا ذکر کیا ہے لیکن کہا ہے کہ یہ زیادتی (وَاِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا) محفوظ نہیں ہے۔(تفصیل دیکھیے. تفسیر القرطبی ۱/ ۱۶۳۔ ومِنَّةُ الْمُنْعِمِ عَلٰى صحيح مسلم ۱/ ۲۷۰) نیز امام بخاری، ابوداؤد، ابوحاتم، ابن معین، الحاکم، الدارقطنی اور دیگر محققین کے نزدیک یہ لفظ (وَ اِذَا قَرَاَفَاَنْصِتُوْا) صحیح نہیں ہیں۔ اگرچہ امام مسلم کے ہاں صحیح ہیں۔لیکن دوسری طرف بھی بڑے بڑے آئمہ حدیث ہیں جن کا ذکر پچھلی سطر میں ہو چکا ہے۔ پھر یہ احناف وغیرہ کی دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ ان کے ہاں امام کے پیچھے قرأت بالکل نہیں کرنا جبکہ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جب امام قرأت کرے تو پھر نہ پڑھو۔ یعنی دعویٰ عام ہے اور دلیل خاص ہے۔ ہاں مالکیہ کی دلیل بن سکتی ہے لیکن الفاظ ہی صحیح نہیں ہیں۔ پھر اگر امام کے سکتات میں فاتحہ پڑھی جائے تو سب حدیثوں پر عمل ہو سکتا ہے۔

ویسے دل میں پڑھنے سے بھی کوئی مسئلہ نہیں بنتا۔ابوہریرہؓ نے کہا تھا "اِقْـرَأْ بِهَـا فِـيْ نَفْسِـكَ" (مسلم) کہ اپنے دل میں پڑھو اور رسول اللہ ﷺ نے بھی کہا ہے کہ امام کے پیچھے جہری نماز میں فاتحہ کے علاوہ اور کچھ نہ پڑھو۔علامہ عبدالرحمان مبارک پوری اس مسئلہ کی بحث کے آخر میں فرماتے ہیں "وَ الْـحَاصِلُ اَنَّ قِرَاءَةَ الْفَاتِحَةِ فِي الصَّلَوَاتِ فَرْضٌ مِنْ فُرُوْضِهَا وَلَمْ يَقُمْ دَلِيْلٌ صَحِيْحٌ عَلَى مَاذَهَبَ اِلَيْهِ الْحَنَفِيَةُ" (تحفة الاحوذی ج 1 ص 58) یعنی کہ سورۃ الفاتحہ کا امام کے پیچھے پڑھنا فرض ہے اور احناف کے موقف پر کوئی صحیح دلیل نہیں ہے۔اسی طرح امام شوکانیؒ نے بحث کے آخر میں کہا ہے کہ امام کے پیچھے سورۃ الفاتحہ پڑھنا فرض ہے اور یہی مسئلہ حق ہے۔(نیل الاوطار ج 1 ص 239)

اِمَام کی قِرَاْت کی ابتداء کس سے ہو؟

امام اپنی قرأت کی ابتداء جہری نماز میں الحمد للہ سے شروع کرے گا۔صحیح بخاری ومسلم و دیگر احادیث سے نبی علیہ السلام، ابوبکرؓ وعمرؓ کا عمومی عمل اس پر دلالت کرتا ہے کہ بسم اللہ کو آہستہ پڑھنا چاہیے۔اگر چہ کچھ ائمہ کا خیال ہے کہ بِسْـمِ الـلّٰـهِ کو بھی اونچا پڑھنا چاہیے۔لیکن پہلا موقف احادیث کے زیادہ موافق ہے۔اگر چہ بِسْمِ اللّٰهِ کو جہراً پڑھنا بھی جائز ہے۔میرے خیال میں اگر اکثر طور پر فاتحہ سے قرأت شروع کرے اور کبھی کبھی بِسْـمِ اللّٰهِ سے تو یہ سب حدیثوں پر عمل ہو سکتا ہے۔

سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ کے معانی:-

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ:-

الحمد للہ (تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں) الحمد پر الف لام جنس کے لیے ہے یعنی ہر قسم کی حمد، تعریف، اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہے۔

حمد اس تعریف کو کہتے ہیں جو محمود کی تعظیم کے ارادے سے اس کے کسی ایسے اچھے وصف پر کی جائے جو اس کے اختیار میں ہو۔علامہ تفتازانیؒ "مختصر المعانی" میں فرماتے ہیں "اَلْحَمْدُ هُوَ

الثَّنَاءُ بِا لْلِسَانِ عَلٰى قَصْدِ التَّعْظِيْمِ سَوَاءٌ تَعَلَّقَ بِا لنِّعْمَةِ اَوْبِغَيْرِهَا" یعنی حمد کسی کی تعظیم کا ارادہ کرتے ہوئے زبان سے تعریف کرنا۔ برابر ہے کہ اس کے ساتھ نعمت کا تعلق ہو یا نہ ہو۔اس کا مفہوم یہ ہوا کہ حمد کا تعلق زبان سے ہوتا ہے اور شکر دل سے یا زبان سے یا اعضاء سے ہوتا ہے۔اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَأْسُ الشُّكْرِ وَمَاشَكَرَ اللّٰهَ عَبْدٌ لَمْ يَحْمَدْهُ" یعنی الحمدللہ شکر کا سر ہے اور جس شخص نے اللہ کی حمد نہیں کی اس نے اس کا شکر بھی نہیں کیا۔اسی لیے سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے بڑھاپے میں اولاد کی نعمت ملنے پر فرمایا:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحَاقَ (سورۃ ابراھیم آیت نمبر ۳۹)

ترجمہ: سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق (دو بیٹے) عطا فرمائے۔

لِلّٰهِ:

لِلّٰهِ لِ+اللّٰهِ الف کو ختم کر کے لام کا لام میں ادغام کر دیا (اللہ کے لیے)۔معنی یہ ہوا کہ ہر قسم کی حمد اللہ کے لیے خاص ہے یا ہر قسم کی حمد کا مستحق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔سورت جاثیہ میں لِلّٰهِ کو مقدم کیا گیا ہے یعنی فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ کے الفاظ ہیں یعنی اللہ ہی کے لیے ہر قسم کی حمد ہے۔یہاں اَلْحَمْدُ کو مقدم کیا گیا ہے اس لیے کہ یہاں مقصود اللہ کی حمد کو ثابت کرنا ہے اور اس کے بعد اللہ کی صفات کا تذکرہ ہے تاکہ موصوف اور صفت کے درمیان اتصال باقی رہے اور تخصیص کی گئی ہے کہ اللہ ہی کے لیے حمد ثابت ہے۔

الحمدللہ کو جملہ اسمیہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اس میں دوام وثبوت پایا جاتا ہے۔

قرآن کی 5 سورتیں بِسْمِ اللّٰهِ کے بعد اَلْحَمْدُلِلّٰهِ سے شروع ہوتی ہیں (فاتحہ،انعام،کہف،سبا،فاطر) اور کلمہ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ کے بعد رَبِّ الْعَالَمِيْنَ پورے قرآن میں 22 دفعہ آیا ہے۔سورت زمر کے آخر میں فرمایا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ " سورت یونس میں اہل جنت کی آخری پکار یہی ہوگی:

وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

ترجمہ: اور ان کی آخری بات یہ ہوگی تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سارے جہانوں کا رب ہے۔

تو اَلْحَمْدُلِلّٰهِ کا معنی یہ ہے کہ ہر قسم کی تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہی مختص ہے۔ کیونکہ وہی پورے جہان کا مدبر و منتظم اور پوری کائنات کا مالک و مختار ہے وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اسکا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ اس لیے ہر قسم کی حمد دنیا و آخرت میں صرف اور صرف اللہ ہی کے لیے ہے۔ جس طرح کہ سورۃ القصص میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ" یعنی کہ دنیا و آخرت میں لائق حمد اللہ ہی کی ذات ہے۔ قرآن میں بے شمار مقامات میں مختلف چیزوں کے لیے یہ صیغہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" استعمال کیا گیا ہے اس لیے ذات کے لحاظ سے اور انعامات کے لحاظ سے ہر لحاظ سے لائق حمد اللہ ہی کی ذات ہے۔ اسی سے توحید الوہیت، توحید عبودیت، ربوبیت، توحید اسماء و صفات ثابت ہوتی ہے۔ اور اسی کو صحیح طریقے سے سمجھنے سے کفر و شرک کی تردید و نفی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت کے بعد کفر و شرک کا امکان ہی پیدا نہیں ہوتا۔

رسول اللہ ﷺ کے بہت سے نام ہیں لیکن آپ کے جو مشہور نام ہیں مثلاً احمد اور محمد ﷺ ان میں بھی اسی مادے کو اور اسی معنی کو ملحوظ رکھا ہوا ہے۔ احمد کا معنی ہے بہت تعریف کرنے والا اور محمد جس کی بہت تعریف کی گئی ہو۔ اور بعض روایات کے مطابق آپ ﷺ کی امت کا نام "حَمَّادُوْنَ" ہے یعنی بہت حمد کرنے والی امت۔ ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ سب سے پہلے جنکو قیامت کے دن جنت کے لیے بلایا جائے گا وہ لوگ ہوں گے جو خوشیوں اور غموں میں اللہ کی حمد کرنے والے ہوں گے۔ اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ "اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ وَالْحَمْدُلِلّٰهِ تَمْلَاُ الْمِيْزَانَ" یعنی پاکیزگی آدھا ایمان ہے اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ میزان کو بھر دیتا ہے (مسلم)۔ رسول اللہ ﷺ کثرت سے اللہ کی حمد بیان کرتے تھے۔ آپ ﷺ اپنی مختلف اوقات کی دعاؤں کو الحمد للہ سے شروع کرتے تھے مثلاً نیند سے اٹھتے وقت، کھانا کھاتے وقت،

قضائے حاجت سے فراغت کے بعد، مصیبت زدہ کو دیکھتے وقت اور سفر سے واپسی پر پڑھتے:

"ائِبُوْنَ، تآئِبُوْنَ، عَابِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ" (مسلم: ۱۳۴۲)

یعنی ہم واپس لوٹنے والے، توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے اور اپنے رب کی ہی حمد بیان کرنے والے ہیں۔ مصیبت پر صبر کرنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ میرے بندے کے لیے ایک محل تیار کرو جسکا نام "بَیْتُ الْحَمْدِ" رکھو۔ قیامت کے دن جو جھنڈا اللہ کے رسول ﷺ کے پاس ہوگا اسکا نام "لِوَاءُ الْحَمْدِ" ہوگا۔ انبیاء، صلحا، سب کے سب اس کے نیچے ہوں گے۔

اللہ یہ ایسا اسم مبارک ہے جو ذاتِ برحق کے لیے خاص ہے۔ جو کہ تمام صفاتِ کمال کو جمع کرنے والا ہے۔ اور یہ نام مخلوق میں کسی کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ اس کے جامد یا مشتق ہونے میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ لیکن عام لوگوں کو اس بحث سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا۔ اس لیے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (تمام جہانوں کا رب ہے):-

رب اصل میں مصدر ہے بمعنی پرورش کرنا لیکن اسم فاعل کے معنی میں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ہر چیز کے لیے اس کے مناسب اسباب مہیا کر کے اسکی پرورش کرنا اور اس کو حد کمال تک پہنچانا۔ معنی یہ ہوا کہ وہ پورے جہان کی پرورش کرنے والا ہے۔

رَبِّ کا معنی مالک، صاحب بھی ہوتا ہے مثلاً "رَبُّ الدَّارِ" گھر والا (مفردات) لیکن یہاں پہلا معنی ہی مراد ہے۔ اور دوسرا معنی بھی ہو سکتا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ جو تمام جہانوں کا مالک و صاحب ہے۔

اسی طرح رب کا اطلاق کبھی اللہ کے علاوہ دوسرے مُرَبِّی پر بھی بولا جاتا ہے جس طرح یوسف علیہ السلام نے کہا تھا "اُذْکُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّکَ (سورۃ یوسف آیت نمبر 42) اِرْجِعْ اِلٰی رَبِّکَ" (سورۃ یوسف آیت نمبر 50) یعنی کہ میرا ذکر اپنے رب (شاہ مصر) کے پاس کرنا۔ اپنے رب (شاہ مصر) کی طرف لوٹ جا۔

العَالَمِینَ :-

یہ عَالَمٌ کی جمع ہے لیکن قیاس کے خلاف ہے کیونکہ فَاعَلٌ کی جمع و۔نون سے نہیں آتی۔امام راغبؒ نے اسکی جمع و۔ن سے لانے کی یہ توجیہ پیش کی ہے کہ اس کے مفہوم میں انسان بھی داخل ہے (مفردات) اور جب کسی لفظ میں دوسری مخلوقات کے ساتھ انسان بھی شامل ہو تو انسان کا حکم غالب ہوتا ہے۔اس لفظ کا اطلاق اللہ کے علاوہ باقی پوری مخلوق پر ہوتا ہے خواہ ان کا وجود ذہنی ہو یا خارجی، اجسام میں ہو یا ارواح میں، آسمان میں ہو یا زمین پر، نظر آئے یا نہ آئے۔جس طرح کہ اللہ تعالیٰ سورۃ الحاقہ میں فرماتے ہیں کہ "فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ O وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ O" یعنی میں قسم اٹھاتا ہوں جسکو تم دیکھتے ہو اور جسکو تم نہیں دیکھتے۔ کیونکہ اس جہان کی قسمیں بے شمار ہیں اُنکی تعداد کا علم سوائے پروردگار کے کسی کو نہیں ہے اس لیے اسکو بصیغہ جمع ذکر کیا ہے۔

نیز امام راغبؒ نے کہا ہے کہ اس کی جمع اس اعتبار سے ہے کہ اس جہان کی ایک ایک قسم ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔مثلاً عالم انسان، عالم ماء (پانی) وغیرہ اس عالم میں حیوانات، نباتات و جمادات سب آتے ہیں۔اور آسمان وغیرہ اور اس کی مخلوقات بھی شامل ہیں۔

پوری مخلوقات کی اصل تربیت اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے اور باقی متعلقین مثلاً والدین وغیرہ کی یہ تربیت جزوی وانفرادی ہے۔نیز مخلوقات کی ایک دوسرے کی تربیت کرنا تو یہ بھی اللہ کے پیدا کئے ہوئے اسباب سے ہے۔جس طرح کہ اللہ تعالیٰ سورۃ النحل میں فرماتے ہیں کہ "وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ" یعنی جو بھی تمہیں نعمتیں میسر ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہیں۔منعم حقیقی اللہ کی ذات ہی ہے۔

جب رَبُّ الْعَالَمِیْنَ کہا گیا ہے تو اس میں انسانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ عبادت بھی اسی اللہ کی کریں۔اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ سورۃ انبیاء میں فرماتے ہیں کہ " وَاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ" یعنی میں ہی (اکیلا) تمہارا رب ہوں تو تم میری ہی عبادت کرو۔نظر اُٹھاؤ اور دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ پوری کائنات کا ذرّا ذرّا انسان کی تربیت

وخدمت کے لیے بنایا گیا ہے اور اسی میں مصروف ہے۔ یہ زمین، آسمان، پہاڑ، بارشیں، سورج و چاند ستارے سب انسان کی خدمت میں مصروف ہیں اور ایک یہ انسان ہے کہ اپنے مقصد کو بھولا ہوا ہے پتہ بھی نہیں کہ اس کو کس لیے پیدا کیا گیا ہے اور اپنے مقصدِ حیات سے کس قدر وہ غفلت کا شکار ہے۔

اللہ رب العالمین ہے اور اس کا نبی رَحْمَةً لِلْعَالَمِيْنَ ہے۔ اس کی کتاب (قرآن) ذِكْرٌ لِلْعَالَمِيْنَ اور هُدًى لِلْمُتَّقِيْنَ ہے۔

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ:-

یہ دونوں مبالغے کے صیغے ہیں اور دونوں کا مادہ ایک ہے (ر ح م) الرَّحْمٰنُ بروزن فَعْلَان کے حروف زیادہ ہیں اس لئے اس میں مبالغہ بھی زیادہ ہے۔ (بہت زیادہ رحم کرنے والا) اور الرَّحِيْم بروزن فَعِيْلٌ ہے۔ اسکا معنی (نہایت رحم کرنے والا) اللہ کی تعریف کی پہلی وجہ اس کا رَبُّ الْعَالَمِيْنَ ہونا ہے اور دوسری اور تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ رحمان اور رحیم ہے۔ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ کے بعد الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اس لیے کہا کہ اللہ جو تربیت عالم کرتا ہے وہ محض اپنی شفقت ورحمت سے کرتا ہے یہ اس پر واجب نہیں ہے کیونکہ اللہ کی رحمت اللہ کے غضب سے سبقت لے گئی ہے۔ اس لیے وہ اپنے بندوں پر بہت رحم کرتا ہے۔

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں صفتوں کا تذکرہ بِسْمِ اللّٰهِ کے بعد بھی ذکر کیا اور اب اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے بعد پھر اسکا تذکرہ کیوں کیا گیا ہے؟

تو اسکا جواب یہ ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ میں بطور تبرک کے ذکر کیا ہے جبکہ یہاں بطور تربیت عالم کے ضمن میں ذکر کیا ہے کہ اسکی صفت ربوبیت اس لئے ہے کہ وہ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ہے رحمت کا معنی توجہ ہوتا ہے۔ لسان العرب میں ہے "اَلرَّحْمَةُ فِى بَنِىْ آدَمَ عِنْدَ الْعَرَبِ رِقَّةُ الْقَلْبِ وَ عَطْفَةٌ" یعنی رحمت کا معنی دل کی نرمی، توجہ مقصود ہوتی ہے رحمان کا تذکرہ اس لیے کیا گیا ہے کہ رحمانیت کا اثر دنیا و آخرت ہر دونوں جہاں پر ہے اور مومن مطیع اور کافر دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جبکہ رحیمیت کا اثر ایمان واطاعت کے ساتھ ہوتا ہے خواہ دنیا میں ہو یا آخرت

میں جس طرح کہ اللہ تعالیٰ سورۃ احزاب میں فرماتے ہیں کہ " وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا" یعنی وہ اللہ مومنوں پر نہایت مہربان ہے تو اسکا مفہوم یہ ہوا کہ رحمانیت میں توسع زیادہ پائی جاتی ہے نعمتوں کی کیفیات و کمیات بھی زیادہ مراد ہیں۔ اور کافر و مومن دونوں ہی اس سے مستفید ہو رہے ہیں اس لیے صفت رحمان بطور عَلَم کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا اطلاق سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی پر درست نہیں ہے کیونکہ بخشش اور انعامات کی وہ شان جو رحمانیت کے اندر ہے کسی دوسرے میں نہیں پائی جاتی جبکہ رحیم کا اطلاق انسان پر بھی ہوتا ہے۔ رسول ﷺ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ التوبہ کے آخر میں فرمایا "بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ" یعنی وہ نبی علیہ السلام مومنوں کے بارے میں بہت نرمی کرنے والے بہت رحم کرنے والے ہیں۔ صحابہؓ کے بارے میں فرمایا

(رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ) کہ آپس میں ایک دوسرے پر بہت رحم کرنے والے ہیں۔ (الفتح/29)

رحمان کو رحیم پر مقدم کرنیکی کیا وجہ ؟

رحمان کو رحیم پر مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آیات میں جو فواصل ہیں اُنکی موافقت کرتے ہوئے اس طرح کیا گیا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ (اللہ) یہ ایسا نام ہے جو کسی اور کے لیے یہ نام رکھنا جائز نہیں ہے اسی طرح الرحمٰن بھی کسی کا نام رکھنا درست نہیں ہے تو دونوں کو قریب اور متصل ذکر کرنا زیادہ بہتر ہے (واللہ اعلم)۔ پھر کفار مکہ رحمان کے نام کو اللہ کے لئے انکار کرتے، نہ مانتے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ سورۃ الفرقان میں فرماتے ہیں کہ: "وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اسْجُدُوا لِلرَّحْمَٰنِ ج قَالُوا وَمَا الرَّحْمَٰنُ ق" ترجمہ: جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں رحمٰن ہے کیا؟ ہم رحمٰن کو نہیں جانتے۔

یہ اُنکی سخت غلطی تھی کہ وہ اللہ کو بطور رحمان نہ پہچانتے تھے کیونکہ رحمان کا معنی وسیع الرحمت ہے کہ جسکی رحمت بڑی وسیع ہو اور یہ نام صرف اللہ کے لیے ہی خاص ہو سکتا ہے اور اسی لیے اسکو مقدم کیا گیا ہے ہمارے ہاں بعض لوگ جہالت کی بناء پر بابا رحمان (ایک شاعر کا نام ہے پشاور میں اس کا دربار ہے) کہتے ہیں یا کسی کا نام عبدالرحمٰن ہو تو صرف رحمان کہنے پر اکتفا کرتے

ہیں ساتھ عبد کو اچھا نہیں سمجھتے یہ غلطی ہے کئی لوگوں نے اپنی دکانوں، سٹوروں کے نام رحمان کے نام پر رکھے ہوئے ہیں جو کہ انتہائی حماقت ہے بعض لوگ دنیا جہاں کے جھوٹے انسان (مسیلمہ کذاب) کو رحمان یمامہ کہتے تھے یہ بات انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ ایک طرف تو رحمان کو جانتے نہ تھے اور دوسری طرف وہ ایک جھوٹے انسان کو رحمان کہتے تھے۔ بہرحال اسم رحمان صرف اللہ کے ساتھ مختص ہے کسی اور پر اسکا اطلاق نہیں ہے۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ:-

مٰلِكِ اور مَلِكِ دو قرأتیں ہیں اور دونوں متواتر ہیں (ابن کثیر)۔ دونوں نبی علیہ السلام سے مروی ہیں (ترمذی)۔ وہ (اللہ) روز جزاء کا مالک ہے یعنی اللہ تعالیٰ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ، اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ہونے کے ساتھ ساتھ جزاء کے دن کا بھی مالک ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی چوتھی صفت ہے۔ بعض مترجمین نے دین کا معنی یہاں انصاف کا کیا ہے اور ترجمہ اس طرح کرتے ہیں کہ انصاف کے دن کا مالک۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن لوگوں کو ان کے اعمال کے مطابق جزاء وسزا دیں گے اور یہی عین انصاف ہے کیونکہ عقلاً یہ بات متصور نہیں ہوسکتی کہ ایک شخص نیک اعمال کرے تقویٰ والی زندگی اختیار کرے اپنے آپ کو برائیوں سے بچائے اور ایک آدمی نہ دین کے شعائر کا خیال رکھے اور نہ نیک اعمال کرے نہ ہی بُرے کاموں سے بچے بھلا یہ دونوں برابر کیسے ہوسکتے ہیں جس طرح کہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں کہ کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے زمین میں فساد کرنے والوں کی طرح کردیں۔ یا ہم پرہیزگاروں کو بدکاروں کی طرح کردیں (سورۃ ص آیت نمبر ۲۸)۔

ایسا نہیں ہوسکتا ایک انسان پر ظلم کیا جاتا ہے۔ اور اسمیں اس ظلم سے بچنے کی طاقت نہیں ہوتی آخر وہ یہ کہتا ہے کہ چلو قیامت کے دن انصاف ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مفلس کون ہے؟ صحابہؓ نے کہا کہ جس کے پاس نہ دینار ہو نہ درہم۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میری امت کا مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نمازیں، زکوٰۃ اور روزے لیکر آئے گا لیکن ساتھ ساتھ کسی کو مارا ہوگا، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا، کسی کو گالی دی ہوگی تو اسکی نیکیاں ان مظلوموں میں

تقسیم کردی جائیں گی اور اگر ان مظلوموں کے کچھ حق باقی ہیں تو ان مظلوموں کی برائیاں اسکو دے دی جائیں گی پھر اس کو جہنم میں پھینک دیا جائیگا (مسلم)۔ حساب پورا پورا ہوگا (لَا ظُلْمَ الْیَوْمَ) اللہ تعالیٰ فرمائیں گے آج کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ حتیٰ کہ حیوانات کے اندر بھی قصاص ہوگا۔ اگر سینگوں والی بکری نے کسی بلا سینگوں والی بکری کو مارا ہوگا تو اس سے بھی قصاص (بدلہ) لیا جائے گا۔ اگر نیک اعمال کئے ہونگے تو جنت میں داخل ہوگا اور اگر برے اعمال کئے ہونگے تو جہنم میں اس کا ٹھکانا ہوگا۔ دین سے مراد جزاء ہے نیک ہو یا بد۔ صحیح بخاری میں ہے کہ "وَالدِّیْنُ الْجَزَاءُ فِی الْخَیْرِ وَالشَّرِّ" یعنی دین جزاء کو کہتے ہیں نیکی میں ہو یا بدی میں۔ حافظ ابن حجر نے دین کے اور معنی بھی کئے ہیں فتح الباری میں انہوں نے (11) معنی نقل کئے ہیں جو تفصیل چاہتا ہے وہاں دیکھ لے (فتح الباری شرح البخاری۔ کتاب التفسیر)۔

یَوْمِ الدِّیْنِ سے مراد قیامت ہے۔ پوری پوری جزاء اور سزا قیامت کے دن ہی ملے گی۔ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ سورۃ آل عمران آیت نمبر ۱۸۵ میں فرماتے ہیں کہ "وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ط" یعنی بات یہی ہے کہ تم کو پورا پورا بدلہ (نیکی یا بدی کا) وہ قیامت کے دن ہی ملے گا۔ دنیا میں کبھی کسی کو گناہ کی سزا ملتی ہے تو یہ جزوی سزا ہے کلی سزا قیامت کو ہی ملے گی۔ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ سورۃ الم سجدہ میں فرماتے ہیں کہ "وَلَنُذِیْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰی دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَکْبَرِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ" یعنی کہ ہم ان (مجرموں) کو عذاب اکبر (قیامت کے بڑے عذاب) سے پہلے عذاب ادنیٰ دنیا میں ہلکے عذاب (سیلاب زلزلے وغیرہ) ضرور چکھائیں گے کہ شاید یہ لوگ لوٹ آئیں۔ اور توبہ کر کے نیک اعمال کرلیں۔

اس طرح سَکَرَاتُ الْمَوْتِ کے وقت بھی انسان کو جزوی سزا و جزاء ملتی ہے۔ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ سورۃ الفجر میں فرماتے ہیں کہ "یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ○ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ○ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ○" یعنی اے اطمینان والی روح۔ تو اپنے رب کی طرف لوٹ چل اس طرح کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے خوش۔ پس میرے خاص بندوں میں داخل ہوجا۔ اور میری جنت میں چلی جا۔

اسی طرح ظالم کافر کی جان نکالتے وقت فرشتے انکے چہروں اور پیٹھوں پر مارتے ہیں (سورۃ محمد:۲۷ اور سورۃ انفال ۵۰) ۔تو یہ جزوی جزاء وسزا ہے عذاب قبر برحق ہے۔ بعض لوگ عذاب قبر کونہیں مانتے یہ انکی بڑی غلطی ہے۔

قیامت کے دن اعمال کا وزن ہوگا جس طرح کہ اللہ تعالیٰ سورۃ اعراف آیت نمبر 8 میں فرماتے ہیں کہ" وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ ج" یعنی اس روز (قیامت کے روز) وزن بھی برحق ہے۔جن کے نیک اعمال کا وزن بھاری ہوا وہ نجات وکامیابی پائیں گے اور جن کے نیک اعمال ہلکے ہوئے تو ان لوگوں نے اپنی جانوں کو خسارے میں ڈالا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ سورۃ انبیاء آیت نمبر 47 میں فرماتے ہیں" وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ط وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَابِهَا ط وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ O" یعنی قیامت کے دن ہم عدل والے ترازو قائم کریں گے۔تو کسی جان پر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔اور اگر ایک رائی کے دانے کے برابر بھی عمل ہوگا ہم اسے حاضر کریں گے،اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے۔

بعض لوگ اسکا انکار کرتے ہیں کہ وزن تو اجسام کا ہوتا ہے اعمال اجسام نہیں ہیں یہ انکی حماقت کی بہت بڑی نشانی ہے اللہ کے آگے کوئی چیز مشکل نہیں ہے جیسے قیامت کے دن زبان کے علاوہ انسان کے دیگر اعضاء کلام کریں گے اور اب تو بجلی کے میٹر لگے ہوئے ہیں جس سے بجلی کی مقدار معلوم ہوجاتی ہے۔بندوں کے اعمال کا قیامت کے دن وزن ہوگا حدیث بطاقہ بھی اس پر دلالت کرتی ہے کہ ایک پلڑے میں بدیوں کے 99 رجسٹر ہونگے اور ایک پلڑے میں وہ کاغذ جس پر"لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ "لکھا ہوگا وہ"لا الہ الا اللہ" بھاری ہوجائے گا۔

کافر لوگ کہتے ہیں کہ مرنا برحق ہے البتہ قبروں سے اُٹھایا جانا یہ ہم نہیں مانتے۔نہ حساب وکتاب مانتے ہیں قرآن کریم کافروں کے انکار کا بڑی تفصیل اور کثرت سے جواب دیتا ہے۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ:-

(اے اللہ خاص تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور خاص تجھ سے ہی ہم مدد مانگتے ہیں)۔

اس جملہ میں صیغہ غائب سے صیغہ خطاب کی طرف التفات ہے کیونکہ اَلْحَمْدُ سے مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ تک انداز گفتگو غائب کے صیغہ کے ساتھ تھا اور اب انداز بدل کر مخاطب کا انداز اِیَّاکَ استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ اِیَّاکَ ضمیر مخاطب ہے تو یہ اس لئے انداز اپنایا کہ سابقہ کلام سے تجلیات الٰہی نازل ہو کر حاضر ہونے کا رتبہ حاصل کراتی ہیں تو اس حضوری حالت میں صیغہ خطاب ہی مناسب ہے (واضح البیان)۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ سابقہ کلام سے انسان گویا کہ اللہ کے قریب ہو گیا ہے اس لیے کہتا ہے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ اَلخ۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایاک مفعول ہے اسکو فعل سے پہلے لایا گیا ہے جبکہ قاعدہ عام یہ ہے کہ پہلے فعل لایا جاتا ہے اور پھر مفعول۔ تو اسکا جواب امام قرطبیؒ نے یہ دیا ہے کہ یہ اہتمام کرتے ہوئے کیونکہ عرب لوگ اہم چیز کو مقدم کرتے ہیں (تفسیر قرطبی ج ۱/ص 190)۔ علامہ ابراہیم میر سیالکوٹیؒ فرماتے ہیں کہ یہ تقدیم حصر اور اختصاص کے لیے ہے اور معنی یہ ہے کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں کسی اور کی نہیں۔

تو مقصد یہ ہے کہ عبادت صرف اللہ کی ہونی چاہیے اور اسکی کرنی چاہیے۔ کیونکہ وہی ہمارا پروردگار ہے وہ قیامت کے دن کا مالک ہے۔ عبادت انتہا درجے کی عاجزی اور تذلل کو کہتے ہیں۔ اسی لیے جو راستہ زیادہ استعمال ہوتا ہو اسکو "طَرِیْقٌ مُعَبَّدٌ" کہتے ہیں۔ تو انتہائی درجے کی عاجزی وانکساری صرف اللہ کے سامنے ہونی چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ معبود کی نہایت درجے کی تعظیم بھی ہونی چاہیے۔ عبادت کرنے سے اللہ کی رضا اور اسکا قرب حاصل ہوتا ہے۔

اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ:۔

یہاں بھی ضمیر مفعول کو مقدم کیا گیا ہے اور مکرر لایا گیا ہے حالانکہ ایک دفعہ بھی کافی تھا۔ تو یہاں بھی حصر کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے اور مکرر لا کر یہ بتایا گیا ہے کہ عبادت اللہ کی کرتے ہوئے مدد بھی اللہ سے ہی مانگنی چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ عبادت تو اللہ کی کریں اور مدد غیر اللہ سے مانگیں۔ جس طرح کہ آج کا مشرک کرتا ہے کہ عبادت اللہ کی کرتا ہے۔ نماز میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پڑھتا ہے۔ لیکن نماز کے بعد وہ درباروں کی طرف رخ کرتا ہے اور وہاں جا کر سجدہ میں

کرتا ہے۔ اُن مُردوں سے مدد مانگتا ہے۔ یہ طریقہ غلط ہے جس کی تم عبادت کرتے ہو کیا وہ (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ) تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ کوئی یا رسول اللہ مدد کہتا ہے کوئی یا علی مدد کہتا ہے یہ سب شرکیہ کام ہیں۔ اللہ سے مدد نہیں مانگتے مخلوق سے مدد مانگتے ہیں۔ خالق سے مدد نہیں مانگتے۔ اس لیے یہاں فرمایا کہ اے اللہ ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور خاص تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں، نہ تیرے سوا ہم کسی کی عبادت کرتے ہیں اور نہ ہی تیرے سوا کسی سے مدد مانگتے ہیں۔

واسطہ اور ذریعہ ہدایت میں ہوتا ہے نہ کہ عبادت میں۔ مشرکوں کو یہی غلطی لگی ہوئی ہے کہ انہوں نے عبادت اور ہدایت میں فرق نہ کیا۔

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ:۔

(اے اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا)

ہدایت کے دو معنی ہیں۔ راستہ دکھانا۔ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ سورۃ فُصِّلَتْ (حم السجدۃ نمبر ۴۱) میں فرماتے ہیں کہ "اَمَّا ثَمُوْدُ فَھَدَیْنَا ھُمْ" یعنی ہم نے قوم ثمود کو راستہ دکھایا۔ یہ صالح علیہ السلام کی قوم تھی انہوں نے ہدایت کا راستہ معلوم ہونے کے باوجود گمراہی اور کفر کو اختیار کیا۔

اور ہدایت کا دوسرا معنی منزل مقصود پر پہنچانا ہے۔ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ سورۃ القصص آیت نمبر 56 میں فرماتے ہیں کہ "اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ" یعنی اے نبی جس سے تم محبت کرتے ہو اس کو ہدایت نہیں دے سکتے اور لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی بھی کسی کو ہدایت نہیں دے سکتا۔ ہاں ہدایت کا راستہ بتا سکتا ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جہنمیوں میں سے ہلکا عذاب ابو طالب کو ہوگا، اس کو آگ کی جوتی پہنائی جائے گی جس سے اس کا دماغ جوش مارے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب سے اس کی موت کے وقت کہا تھا کہ میرے کان میں کلمہ پڑھ لے میں اللہ کے ہاں تیری سفارش کروں گا۔ لیکن اس نے انکار کیا اس وقت آیت اتری اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ الخ (صحیح مسلم)۔ بعض لوگ (شیعہ وغیرہ) ابو طالب کے ایمان کو ثابت کرتے ہیں لیکن صحیح

احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایمان نہ لایا۔

تو جس جگہ رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کی نفی کی گئی ہے وہاں دوسرا معنی مراد ہے یعنی منزل مقصود پر پہنچانا۔ کیونکہ یہ کام اللہ کے اختیار میں ہے اور جس جگہ اللہ کے رسول ﷺ کی طرف ہدایت کی نسبت کی گئی ہے وہاں مراد راستہ دکھانا ہے۔ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ سورۃ المومنون آیت نمبر 73 میں فرماتے ہیں کہ "وَ اِنَّکَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ" یعنی اے نبی تو یقیناً ان کو صراط مستقیم کی طرف بلاتا ہے۔ صراط مستقیم کیا ہے؟ صراط مستقیم عقائد حقہ اور اعمال صالحہ ہیں۔ اللہ کو اپنا رب ماننا اور اسی کی عبادت کرنا۔ جس طرح کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا "اِنَّ اللّٰهَ رَبِّىْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ" بے شک اللہ میرا رب اور تمہارا رب ہے تو تم اسی کی عبادت کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک نمازی یہ کلمات کہتا ہے جبکہ وہ صراط مستقیم پر ہے اسی لیے تو وہ نماز پڑھنے آیا ہے تو یہ کلمات کہنے کا کیا مقصد؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ مقصود یہ ہے کہ اس ہدایت پر ہمیں ثابت قدم رکھ۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے "يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِىْ عَلٰى دِيْنِكَ" یعنی اے دلوں کو پھیرنے والی ذات میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔ آج کل فتنوں کا دور ہے بے شمار فرقے صراط مستقیم پر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ جبکہ وہ صراط مستقیم سے کوسوں دور ہیں ہر وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ ہمیں صراط مستقیم پر رکھے اور اسی پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

"صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ" سابقہ دعا کی یہ تفسیر اور تتمہ ہے کہ ان لوگوں کا راستہ دکھا جن پر تو نے انعام کیا، نہ کہ ان کا جن پر غضب نازل کیا گیا اور نہ (انکا) جو گمراہ ہوئے۔

صراط مستقیم اور انعام والے لوگ کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے حکموں پر چلتے ہیں اور یہ چار گروہ ہیں۔ جس طرح کہ اس کی تفسیر آیت قرآنی سے ہو رہی ہے فرمایا "مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا" ترجمہ: یعنی جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی

اطاعت کرے گا تو وہ (قیامت کے دن) ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جن پر اللہ نے انعام کیا۔ نبیوں سے اور صدیقوں سے اور شہداء سے اور نیک لوگوں سے اور یہ لوگ رفاقت کے لحاظ سے بہت اچھے ہیں سورۃ النساء آیت نمبر 69۔ اس آیت سے صراط مستقیم متعین ہو گیا کہ انعام یافتہ لوگوں کا راستہ مطلوب ہے اور یہ بھی پتہ چلا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ سب سے پہلا گروہ انبیاء علیہم السلام کا گروہ ہے۔ ان کی پیروی ضروری ہے۔ کیونکہ ہماری کتاب قرآن رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی یہ کتاب آپ کی اتباع پر زور دیتی ہے یعنی نبی کریم علیہ السلام کی اتباع ضروری ہے۔ اسی میں ہماری دنیا و آخرت کی نجات ہے۔ قرآن و حدیث میں کسی اور ہستی کو (خواہ وہ امام ہو، ولی ہو) ہمارے لیے نمونہ نہیں بنایا۔ بلکہ اگر نمونہ ہے تو وہ نبی کریم علیہ السلام کی ذات مقدس ہے۔ قرآن میں بے شمار آیات میں آپ کی ہی اتباع کو لازمی قرار دیا گیا۔

اس کے بعد صدیقوں کا گروہ ہے کیونکہ صدیق کا مقام بھی بہت اونچا ہے اس کو نبی سے کمال قسم کی مشابہت ہوتی ہے یہ نبی کی ہر بات کو صداقت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور قبول حق میں اس کے سامنے کوئی حجاب حائل نہیں ہوتا۔ وہ اخلاص عمل میں بھی اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ہوتا ہے "وَالَّذِیْ جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ" یعنی کہ جو نبی (علیہ السلام) سچ لے کر آئے اور وہ جس نے اس کی تصدیق کی یہ سب متقی ہیں۔ اسی وجہ سے صدیق اکبرؓ کا مقام انبیاء علیہم السلام کے بعد ہے اور مقام صدیقیت میں سب سے اوپر ہیں۔ آپ نے ابوبکرؓ پر اسلام پیش کیا۔ آپؓ نے اسی وقت اسلام قبول کر لیا۔ واقعہ اسراء و معراج میں آپ کی تصدیق بہت معنی رکھتی ہے۔ جس سے آپ کو صدیق کا لقب ملا آپ علیہ السلام کی زندگی میں بے شمار واقعات اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد کئی قبائل کا اِرْتِدَادٌ عَنِ الْاِسْلَامِ (اسلام کو چھوڑ دینا) اور آپ کا ان سے مقابلہ اور جنگ واقعی صدیق ہونے کا حق ادا کر دیا۔ اس کے بعد شہداء کا مقام ہے۔ یہ بھی بہت بلند مقام ہے۔ ان کا ساتھ بھی باعث افتخار ہے کہ جنہوں نے اپنی جانوں کو اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے ہوئے قربان کر دیا۔ اور احادیث میں ان کی بہت بڑی فضیلت آئی ہے۔ قرآن نے ان کے بارے میں بیان فرمایا کہ شہید کو مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں ان کو اللہ کی طرف سے رزق پہنچتا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے بھی شہادت کی تمنا کی۔

اس کے بعد مرتبہ صالحیت کا ہے۔ یہ مقام اولیاء اللہ اور متقین کا ہے یہ عام ہے اور ایک

معنی کے اعتبار سے صالحین انبیاء علیہم السلام بھی ہیں۔ یہ خاص مقام ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا "وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ" یعنی بے شک وہ آخرت میں نیک لوگوں سے ہوں گے۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا "وَاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ" یعنی مجھے صالحین سے ملا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقام صالحیت مقامات نبوت میں سے ایک بہت بلند مقام ہے۔ لیکن جو آیت سورۃ النساء کی ہے اس سے مراد پہلی قسم ہے۔ یعنی اولیاء اللہ اور متقین لوگ۔

مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ (جن پر غضب ہوا):-

مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد یہودی ہیں کیونکہ قرآن میں بہت سے مقامات میں غضب کا لفظ ان کے حق میں آیا ہے۔ مثلاً سورۃ البقرۃ آیت 90 میں فرمایا "فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ" اور سورۃ المائدہ آیت نمبر 60 میں فرمایا "مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ" اللہ نے اس پر لعنت کی اور اس پر غضب ناک ہوا۔

اَلضَّآلِّيْنَ :-

ضالین سے مراد نصاریٰ ہیں جس طرح فرمایا "ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ" المائدہ 77/5۔ یعنی پہلے سے گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور (خود بھی) سیدھے راستے سے گمراہ ہوئے۔ اور ترمذی کی حدیث میں بھی رسول اللہ ﷺ نے وضاحت فرمائی ہے کہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد یہود اور اَلضَّآلِّيْنَ سے مراد نصاریٰ ہیں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور یہود و نصاریٰ کے طریقوں سے محفوظ فرمائے۔ اور نبی علیہ السلام کا سچا تابعدار بنائے اور سورۃ الفاتحہ پر پورا عمل کرنے والا بنائے اور اسلام کی صحیح سمجھ عطا فرمائے۔ (آمین یارب العالمین)

اگر اس کتاب میں کوئی بات کتاب و سنت کے خلاف ہے تو ہم اس سے برأت کا اظہار کرتے ہیں اور اگر اچھی چیز ہے تو یہ محض اللہ کی توفیق سے ہے۔

"وَمَا تَوْفِيْقِیْ اِلَّا بِاللّٰهِ وَاللّٰهَ اَسْئَلُ اَنْ يَّتَقَبَّلَهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ"

